R. No. 2186/57

Regd. No. L. 927

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29

Annual Rs. 4/-

Per Copy 12 P.

Date 1-8-15-22

یکم مئی ۱۹۶۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۱۷

اداریہ

پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعلیم کے سلسلے میں سفارشیں

نئے وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین نے کوٹھاری کمیشن کی سفارشوں پر غور کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے ممبروں کی ایک کمیٹی بنائی ہے جو خاصی نمائندہ ہے۔ اس کمیٹی کے جلسے ۲۶ اور ۲۷ اپریل کو دہلی میں ہوئے۔ کمیٹی نے سہ لسانی فارمولے کا از سر نو جائزہ لیا۔ پہلے دن اس کی رائے یہ تھی کہ بجائے تین زبانوں کے دو زبانوں کا علم کافی سمجھا جائے اور آٹھویں درجے سے کوئی طالب علم چاہے تو تیسری زبان بھی سیکھ لے۔ مگر دوسرے دن اس معاملے میں زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ جس طالب علم نے آٹھویں درجے تک ہندی یا انگریزی نہیں پڑھی ہے وہ آٹھویں سے دسویں درجے تک ان میں سے کوئی زبان ضرور پڑھے۔ اس کی دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو وہ ہندی یا انگریزی تیسری زبان کے طور پر پڑھے گا یا اس نے جو دوسری زبان چھٹے درجے سے شروع کی ہے اسے ساتویں کے بعد چھوڑ دے گا۔ یعنی یہاں بھی طالب علم کی سہولت دیکھی جائے گی۔ اس پر جبر صرف اتنا ہوگا کہ اسے انگریزی یا ہندی میں سے کوئی زبان آٹھویں سے دسویں تک ضرور پڑھنی پڑے گی۔

نئی اسکیم کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ والدین کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے ان کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے انتظام کا حق مانگیں اور اس مطالبے کو پورا کرنے کے لیے پوری کوشش کی جائے گی۔ اگر کسی کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دی گئی ہے جو علاقائی زبان نہیں ہے تو اگر طالب علم چاہے تو علاقائی زبان بھی ابتدائی درجے میں پڑھائی جا سکتی ہے۔ پھر اگر ایک اچھی خاصی تعداد میں طلبہ مثلاً تین سو طلبہ یہ چاہیں کہ ان کو اعلیٰ تعلیم کسی ایسی زبان میں دی جائے جو دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل ہے اور علاقائی زبان نہیں ہے تو حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ یا تو ایسا کالج قائم کرے یا اسے مناسب امداد دے۔ لسانی اقلیتوں کو ایسے کالج قائم کرنے کا حق ہوگا جن میں ان کی زبان ذریعہ تعلیم ہوگی اور حکومت ایسے کالجوں کو امداد بھی دے گی۔

اگر پارلیمنٹ کے ممبروں کی یہ سفارش بالآخر حکومت ہند نے منظور کر لی اور ریاستی حکومتوں نے بھی اس پر عمل کرنا تسلیم کر لیا تو اردو والوں کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس اسکیم کے مطابق اردو میں ابتدائی درجے سے تعلیم دی جا سکے گی۔ دوسری زبان کے طور پر وہ جب چاہیں خواہ ابتدائی منزل پر خواہ چھٹے درجے سے علاقائی زبان پڑھ سکیں گے۔ اور آٹھویں درجے سے ہندی یا انگریزی میں سے کوئی ایک زبان بھی سیکھ سکیں گے۔ پھر نہ صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی مادری زبان میں دی جا سکے گی اور اس طرح طلبہ کی شخصیت کی تعمیر صحیح بنیادوں پر ہوگی۔

کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ پانچ سال کے اندر تمام یونیورسٹیوں میں تعلیم علاقائی زبانوں کے ذریعے دینے کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں، لیکن ایسے ادارے جن میں سارے ہندوستان سے طلبہ آتے ہیں صرف ہندی یا صرف انگریزی کے ذریعے سے بھی تعلیم دے سکتے ہیں یعنی یہ اصول تو تسلیم کر لیا گیا کہ اعلیٰ تعلیم بھی علاقائی زبانوں کے ذریعے سے ہونی چاہیے۔ اگر ملک کے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہندی یا انگریزی کے ذریعے سے تعلیم کی ضرورت کو بھی تسلیم کر لیا گیا اور اس کے ساتھ لسانی اقلیتوں کی زبان میں اعلیٰ تعلیم کے اصول کو بھی تسلیم کر لیا گیا۔ تمام زبانوں میں مناسب ترجمے تیار کرنے کے لیے ایک بڑے اور جامع پروگرام کی سفارش کی گئی۔ یہ کام مرکزی حکومت کرے گی۔ اصطلاحوں کے سلسلے میں یہ سفارش بھی قابل غور ہے کہ سب زبانوں میں ایک سی اصطلاحیں استعمال ہوں۔ اگر ان کے انتخاب میں چلن اور سہولت کو مد نظر رکھا جائے اور بے جا ضد سے کام نہ لیا جائے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

مجموعی طور پر تعلیمی اور لسانی مسائل کے سلسلے میں یہ سفارشیں ایک اچھا قدم ہیں اور ان میں لسانی اقلیتوں کے حقوق کا صاف اور واضح طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اول تو ان کو مرکز اور ریاستی حکومتیں منظور کر لیں اور پھر ان پر ایمانداری سے عمل کریں۔ اچھی باتیں تو کبھی کبھار سننے میں تو ضرور آتی ہیں مگر عمل کے معاملے میں ایسی سستی اور کوتاہی ہے کہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ نئے حالات میں حقائق کا احساس بڑھا ہے اب یہ احساس عمل میں بدل جائے تو بات ہے۔

نیویارک کالج جہاں اردو زبان لازمی اور اردو بولنا ضروری ہوگا

نیویارک۔ نیویارک کی فورڈہام یونیورسٹی میں ایک نیا کالج قائم کیا جا رہا ہے جس میں تعلیم پانے والے طلبہ کے لیے یہ لازمی ہوگا کہ وہ اردو بولنا سیکھیں۔ اس کالج میں اردو کو ایک لازمی مضمون قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(سیاست جدید)

قاہرہ میں اردو کانفرنس کا انعقاد

اپریل کے پہلے ہفتہ میں قاہرہ میں ایک اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ ویسے تو قاہرہ میں اردو جاننے والے ہندوستانی و پاکستانی طالب علموں اور استادوں کی کافی تعداد ہے۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانوں میں بھی کافی اردو داں ہیں پھر کئی مصری اہل علم اردو سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں اور یہاں کبھی کبھی مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ پہلی مرتبہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر اور ایسی کامیاب کانفرنس ہوئی۔

کانفرنس کا افتتاح مصری محکمۂ ثقافت کے سکریٹری نے وزیر ثقافت ڈاکٹر ثروت اکاشہ کی طرف سے کیا۔ پہلے دن کا پروگرام زیادہ تر عربی زبان میں تھا۔ تقریروں میں عرب و برصغیر ہند و پاکستان کے قریبی تہذیبی تعلقات اور اردو زبان وادب اور عربی زبان وادب کے گہرے تعلق پر روشنی ڈالی گئی باقی دو دن کے اجلاس میں اردو زبان وادب پر مقالات پڑھے گئے طبع زاد کہانیاں اور عربی ادب کے تراجم پڑھے گئے۔ ایک شب مشاعرے کے لیے اور آخری شب موسیقی کے لیے مخصوص رہی۔

ان تمام پروگراموں میں ہندوستانی، پاکستانی اور مصری اہل ذوق کی کافی بڑی تعداد شریک ہوتی رہی۔ بعض اجلاس مثلاً مقالوں اور افسانوں کے بعض اوقات کافی صبر آزما تھے لیکن لوگوں کا ذوق وشوق اتنا بلند تھا کہ ہال ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ مشاعرے اور موسیقی کے پروگرام میں تل رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔

اس کانفرنس نے یہاں کے اہل ذوق میں بڑی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور اب امید ہے کہ اس قسم کی سرگرمیاں ایک باقاعدہ شکل اختیار کرلیں گی یہ کانفرنس کافی تیاریوں کے بعد کی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے صدر مسٹر کلیم اللہ سکریٹری افریشیائی اتحاد کمیٹی، اور سکریٹری پروفیسر عبد الہادی (پاکستان) تھے اور اس کے ممبروں میں کئی اساتذہ اور اہل علم شامل تھے۔

(حیات، دہلی)

زباں دانی کا جدید ترین مرکز

مانسٹر۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کی مانسٹر یونیورسٹی نے شہر کی ایک نواحی بستی کے ایک پرانے قلعے کی عمارت میں دس لاکھ جرمن مارک کی بھاری لاگت سے زباں دانی اور ترجمانی کی تعلیم و تربیت کا ایک اسکول کھولا ہے جو سارے یورپ میں اپنے طرز کا سب سے جدید اور بہترین ادارہ کہلانے کا مستحق ہے۔ یورپ کی اس جدید ترین لسانی اکیڈمی میں بیرونی زبانوں کی تعلیم، علم الصوت اور برقیاتی صنعتوں کی تمام عالیہ دریافتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ادارے کے سازوسامان میں صوت ونشریات کی ہر ممکنہ سہولتیں شامل ہیں۔ ہر نشست پر جدید فون، پش بٹن اور مائیکروفون لگے ہوئے ہیں، متعدد ٹیپ ریکارڈروں سے لیس ایک مرکزی کنٹرول روم سے اس ادارے کی دونوں جلسہ گاہوں کی بیک وقت نگرانی کی جا سکتی ہے۔ ترجمانی کا کام سکھلانے کے کمروں میں سائنس کی ایک اور نئی ایجاد سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جسے اس ادارے کے کارکن مزاحاً لسانی دماغ تراشی کہا کرتے ہیں۔ یہاں استاد اپنے ہیڈ فون کے ذریعے ایک کان سے ٹیپ ریکارڈر کا وہ اصلی متن سنتا ہے جو استاد اور شاگرد دونوں کے سننے کے لیے بج رہا ہوتا ہے اور دوسرے کان سے وہ شاگرد کا ترجمہ سنتا ہے۔ اس طرح استاد بیک وقت متن اور ترجمہ سن کر شاگرد کی غلطیوں کو فوراً درست کر سکتا ہے۔

(نگار، بھوپال)

سابق گورنر یوپی ڈاکٹر بی راما کرشنا راؤ کی ادبی سرگرمی

ایک خبر کے مطابق سابق گورنر یوپی جناب ڈاکٹر بی راما کرشنا راؤ تلگو میں عمر خیام اور سرمد کے کلام کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ موصوف اس سے پہلے فارسی ادب کی تاریخ کا تلگو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

انجمن اسلام بمبئی میں مضمون نگاری کا انعامی مقابلہ

انجمن اسلام بمبئی نے جو ریاست کا سب سے قدیم اور ترقی پسند ادارہ ہے اب ایک نیا قدم اور بڑھایا ہے۔ اس نے طے کیا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ سے اردو میں انعامی مضامین لکھائے جائیں۔ یہ مضامین زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوں۔ اس سلسلہ میں تین انعامات دیے جائیں گے:۔

۱۔ پہلا انعام پانچ سو روپے
۲۔ دوسرا انعام تین سو روپے
۳۔ تیسرا انعام ڈیڑھ سو روپے

یہ مضامین فلسکیپ سائز کے کاغذ پر خوشخط لکھے جائیں اور مضمون نگار اپنا نام اور پتہ ایک الگ کاغذ پر لکھ کر مضمون کے ساتھ منسلک کریں۔

عنوانات برائے مضمون نگاری حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اردو کا سائنسی ادب
۲۔ اردو زبان کا مذہبی ورثہ
۳۔ ہندوستانی تہذیب کے عناصر
۴۔ ہندوستانی معاشرت کی اصلاح میں اردو کا حصہ

مضامین کی وصولیابی کی آخری تاریخ یکم ستمبر ۱۹۷۶ء ہے مضامین مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجے جائیں:۔

ڈائرکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ہمزہ کیوں؟

(۱)

یہ غلط فہمی افسوس ناک حد تک عام ہے کہ لسانیات اُردو رسم الخط میں ہمزہ کو گردن زدنی سمجھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں کبھی اُردو صوتیات کی بحث ہوتی ہے، ہمزہ کو "علامتِ بے صوت" کہا جاتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں۔ اپنے کتابچے "اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور اپنی دوسری تحریروں میں جہاں بھی ہمزہ کا ذکر آیا ہے، میں نے یہی عرض کیا ہے، لیکن ان سب میں بحث آواز کی تھی، علامت کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کی نہیں۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں "اُردو زبان و ادب پر جو سیمینار ہوا تھا" اس میں بھی ہمزہ کا ذکر برسبیلِ تذکرہ آیا تھا:

"اُردو میں صدیوں سے ایک رسم چلی آتی ہے کہ اُٹھئے، کیجئے، جائیے، گئے، دیئے، لئے وغیرہ الفاظ کو اکثر ہمزہ سے لکھتے ہیں، سو سب آنکھ بند کیے اسی لکیر کو پیٹتے چلے جاتے ہیں۔ ابتدائی اسکولوں کا کیا ذکر، ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتنے لوگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ ہمزہ آخر استعمال کس لیے کیا جاتا ہے؟ اُردو کے صوتیاتی نظام میں وہ کون سی آواز ہے جس کے لیے ہم اس علامت کو استعمال کرتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ عربی میں ہمزہ کی حیثیت ایک مصمتے کی ہے جبکہ اُردو میں یہ مصمتہ نہیں۔ اُردو میں اس کی اپنی الگ سے ایسی کوئی آواز نہیں، جیسی کسرہ یا فتح کی ہے، اس لیے اسے علامتِ بے صوت کہنا مناسب ہوگا۔ بعض الفاظ میں عام لوگ تو کیا اُردو کے اچھے اچھے ادیب بھی اوپر ہمزہ لکھتے ہیں اور نیچے دو نقطے بھی لگا دیتے ہیں۔ اُردو میں اس کا رواج اب 'غلط العام' کا درجہ حاصل کر چکا ہے..... یہ مضمون اُردو رسم الخط پر نہیں، ورنہ ہم اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے کہ اُردو میں ہمزہ کی علامت گردن زدنی ہے کہ نہیں۔ اس وقت جس بات پر زور دیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ حرف و صوت کے باہمی رشتے سے بے توجہی کی جیسی مثالیں اُردو میں ملتی ہیں، کم زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں عام پڑھنے لکھنے والوں کا کیا قصور، جب خود پڑھانے والوں کو خبر نہیں کہ جس علامت کو وہ استعمال کرتے ہیں اُسے کیوں استعمال کرتے ہیں۔"

اس بیان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا کہ لسانیات ہمزہ کے خلاف ہے اور ایک صاحب نے تو "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں مفصل مضمون بھی لکھا، لیکن جیسا کہ اُن سے توقع تھی، انھوں نے نہ تو لسانیات کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور نہ ہی موضوع سے پورا انصاف کیا۔ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ اعتراض اس پر نہیں تھا کہ ہمزہ اُردو میں کیوں استعمال ہوتا ہے، بلکہ اعتراض اس پر تھا کہ اُردو لکھنے والوں پر حرف و صوت کا رشتہ پوری طرح واضح نہیں، اس لیے ہمزہ کا استعمال کئی لفظوں میں غلط ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہمزہ کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، صوتیات کی مدد سے ہمزہ کا صحیح منصب معلوم کیا جائے اور اُردو رسم الخط کی سطح پر اس کے استعمال کے اصولوں اور حدود کا پتہ چلایا جائے۔ اس کے بعد یہ نتیجہ خود بخود ہی نکالا جا سکتا ہے کہ ہمزہ کو اُردو رسم الخط میں باقی رکھنا چاہیے یا نہیں۔

۱۰۱- سب سے پہلے ان چند الفاظ کو دیکھیے:

جاؤں، کھاؤ، آئیں، پائے، آشنائی، ہیئت، غائب

اب انھیں تلفظ کے اعتبار سے صوتیاتی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے:

|āšnā+ī| |pā+e| |ā+ẽ| |khā+o| |jā+ū|

|ġā+eb| |hai+at|

ان الفاظ میں جہاں جہاں بھی اُردو رسم الخط میں ہمزہ آیا ہے، صوتیاتی رسم الخط میں میں نے اُسے جمع کے نشان سے ظاہر کیا ہے۔ اب ان الفاظ میں جن دو آوازوں کے درمیان جمع کا نشان ہے، انھیں بالترتیب لکھا جاتا ہے:

|ā+ī| |ā+e| |ā+ẽ| |ā+o| |ā+ū|

|ā+e| |ai+a|

۱۰۲- ان چند الفاظ کے اس تجزیے کی روشنی میں ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

(۱) اُردو میں ہمزہ محض دو ساتھ ساتھ آنے والے مصوتوں (CONJUNCT VOWELS) کے جوڑ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ الگ سے لکھے ہوئے دو دو مصوتوں کے جوڑ سے ثابت ہوتا ہے۔

(۲) اُردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں۔ مثلاً جاؤں میں پہلے مصوتے /ā/ کے لیے الف اور دوسرے مصوتے /ū/ کے لیے واؤ موجود ہے۔ اسی طرح کھاؤ میں /ā/ کے لیے الف اور /o/ کے لیے واؤ؛ آئیں اور پائے میں /ā/ کے لیے الف اور /e/ کے لیے یائے مجہول؛ اور آشنائی میں /ā/ کے لیے الف اور /ī/ کے لیے یائے معروف موجود ہے۔ جب ہر جگہ مصوتوں کے لیے اپنی اپنی علامتیں موجود ہیں تو ہمزہ کی آواز کیا ہوئی؟ چنانچہ ثابت ہے کہ ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں، بلکہ یہ دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان کرتا ہے۔

۱؎ یہ مضمون چونکہ عام پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا ہے، اس میں جڑواں اور غیر جڑواں مصوتوں کا سوال عمداً نہیں اُٹھایا گیا۔

یعنی یہ علامت بے صوت تو ہے لیکن بے مصرف علامت نہیں۔ اُردو میں اسے املائی سہولت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ الف کے بعد واؤ یا یے کی آوازیں بغیر ہمزہ کے ادا ہو ہی نہیں سکتیں۔ البتہ آخری دو لفظوں یعنی ہیئت اور غائب سے شبہ ہو سکتا ہے کہ ان میں ہمزہ کی اپنی آواز ہے۔ ہیئت میں پہلا مصوتہ /ai/ یعنی یائے لین ہے اور دوسرے یعنی /a/ کے لیے سوائے ہمزہ کے کچھ بھی نہیں؛ اسی طرح غائب میں پہلا مصوتہ /ā/ یعنی الف ہے اور دوسرے یعنی [ɛ] کے لیے سوائے ہمزہ کے کچھ بھی نہیں۔ تو کیا ان لفظوں میں ہمزہ بالترتیب /a/ اور [ɛ] کی آواز دے رہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ محض نظر کا دھوکا ہے۔ /a/ اور [ɛ] دونوں چھوٹے مصوتے ہیں اور اُردو میں رواج ہے کہ چھوٹے مصوتوں کی علامتیں یعنی فتح، کسرہ وغیرہ اکثر لگائی ہی نہیں جاتیں۔ یہی حال ان دونوں الفاظ کا ہے، ہیئت دراصل ہیَئت ہے اور غائب دراصل غائِب ہے یعنی ہیئت میں جہاں /a/ ہے وہاں دراصل ہمزہ پر فتح ہے اور غائب میں جہاں [ɛ] ہے وہاں ہمزہ کے نیچے کسرہ ہے۔ لیکن چونکہ اُردو میں /a/ اور [ɛ] بالترتیب فتح اور کسرہ کی آوازیں ہیں، اس لیے ہمزہ تو پہلے پانچ الفاظ کی طرح ان دو الفاظ میں بھی محض دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان ہے؛ آوازیں حسبِ سابق دوسری علامتوں کی ہیں۔ اُردو میں ہمزہ کی اپنی کوئی منفرد آواز نہیں۔

(۳) بخلاف عربی زبان کے اُردو میں ہمزہ مصمتے کا درجہ نہیں رکھتا۔ (صرف ایک مستعار لفظ میں یہ حلقی بندشی آواز (GLOTTAL CATCH) کے شائبے سے بولا جاتا ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔)

(۴) ہمزہ دیسی اور مستعار (LOAN) دونوں طرح کے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے۔ اوپر کی مثالوں میں پہلے چار لفظ دیسی ہیں اور آخری تین مستعار۔

۲۶۰۔ دیسی الفاظ:

یہ جان لینے کے بعد کہ ہمزہ کو ہم دیسی الفاظ میں بھی استعمال کرتے ہیں، یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو نے ہمزہ کو اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا لیا ہے؛ یعنی ہم نے ہمزہ کی بقول برجوہن دتاتریہ کیفی "کایا پلٹ" کر لی ہے۔ عربی میں ہمزہ مصمتہ ہے، ہمارے ہاں یہ مصمتہ نہیں، بلکہ اس کی مصوتوں سے ہٹ کر الگ سے اپنی کوئی آواز بھی نہیں ہے اور یہ صرف دو مصوتوں کے جوڑ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی یہ املائی سہولت کی چیز ہے۔

۲۶۱۔ اس تمہید کے بعد اب ہم پہلے دیسی الفاظ کو لیں گے۔ جن دیسی الفاظ میں ہمزہ کا استعمال ہوتا ہے، ان میں نظر سب سے پہلے افعال پر پڑتی ہے۔ ان کی کئی تصریفی صورتوں کو اُردو میں ہمزہ کے بغیر لکھنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر دیکھیے

جانا سے جاؤں، جائیں، جاؤ، جائے
کھانا سے کھاؤں، کھائیں، کھاؤ، کھائے
آنا سے آؤں، آئیں، آؤ، آئے، علیٰ ہذا القیاس۔

جانا کی ماضی واحد مذکر "گیا" ہے، لیکن اس کی جمع مذکر "گئے"، واحد مؤنث "گئی" اور جمع مؤنث "گئیں"، تینوں کو ہمزہ سے لکھا جاتا ہے۔ گیا میں نیم مصوتہ ی /y/ سے پہلے زبر ہے اور بعد میں الف؛ اس صوتی ماحول میں تو نیم مصوتہ اپنی آواز کو برقرار رکھتا ہے، جب کہ ی /ī/ اور ے /e/ سے پہلے یہ اُن میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہی حال کھانا، آنا وغیرہ دوسرے افعال کا ہے۔ ان کی ماضی واحد مذکر تو ی /y/ ہی سے لکھی جاتی ہے، لیکن ان کی تصریفی صورتیں یعنی کھائی، کھائیں، کھائے؛ آئی، آئیں، آئے ہمزہ سے لکھی جاتی ہیں۔

۲۶۲۔ اوپر ہم نے جانا، کھانا، آنا جن مصادر کو لیا، ان میں مادۂ فعل یعنی جا، کھا، آ الف پر ختم ہوتا ہے۔ اب ان افعال کو لیجیے جن کے مادۂ فعل واؤ پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً سونا، رونا، دھونا۔ ہمزہ کے استعمال کے سلسلے میں یہ افعال بھی الف پر ختم ہونے والے افعال کی شق میں رکھے جا سکتے ہیں اور ان کی تصریفی صورتوں میں بھی ہمزہ اسی طرح آتا ہے جس طرح جانا، کھانا، آنا میں، مثلاً سوؤں، سوئیں، سوؤ، سوئے، سویا، سوئی، سوئیں وغیرہ۔ (البتہ ہونا کی ماضی ہوا اس اصول سے مستثنیٰ ہے[1]۔ اُردو میں واؤ اور الف کے جوڑ پر ہمزہ نہیں لگتا، یعنی ہوا میں ہمزہ استعمالِ عام کے خلاف ہے۔ باقی ہوئی، ہوئیں، ہوئے سب ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں۔)

۲۶۳۔ یائے معروف اور مجہول پر ختم ہونے والے افعال کا معاملہ برعکس ہے۔ ان کی تصریفی صورتوں میں ہمزہ کا استعمال نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ ان میں جہاں جہاں نیم مصوتہ ی آیا ہے، اس سے پہلے /ī/ یعنی کسرہ ہے اور اس صوتی ماحول میں نیم مصوتہ /y/ اپنی آواز برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کا صحیح املا نیم مصوتہ ی /y/ ہی سے ہے، مثلاً:

(یائے معروف) پینا سے پیوں، پییں، پیو، پیے، پیا

---

[1] برجوہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب منشورات میں ہوا کو ہر جگہ ہمزہ کے ساتھ لکھا ہے (بعض اور حضرات کے ہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں) شاید اوّل تو اس لیے کہ ہوا (بمعنی باد) سے التباس نہ ہو، دوسرے یہ کہ ہوئے، ہوئی، ہوئیں سب ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں اور غالباً وجدانی طور پر یہ احساس کام کرتا ہے کہ جہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں گے انھیں ہمزہ سے ظاہر کیا جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہوا میں چلن اس کے خلاف ہے۔

(باقی)

غزلیں

علیم افسر غازی پوری

ہر گلی شہر کی ویران ہے نہ جانے کیا ہو — اور جنگل میں چراغاں ہے نہ جانے کیا ہو
دامنِ دل کی جو کرتا تھا کبھی بخیہ گری — وہ بھی اب چاک گریباں ہے نہ جانے کیا ہو
لوگ پھرتے ہیں یہاں طنز کے پتھر لے کر — جسمِ ہر یار کا عریاں ہے نہ جانے کیا ہو
وہم کی طرح جو دل میں تھا یقینِ توحید — اب وہی دشمنِ ایماں ہے نہ جانے کیا ہو
جسم اک پھول ہے اور زیست ہے اڑتا ہوا رنگ — ہر نفس بوئے پریشاں ہے نہ جانے کیا ہو
شہر بیداری سے بھاگے کہ سکوں مل جائے — نیند کا گاؤں بھی ویراں ہے نہ جانے کیا ہو

لوگ پہنانے چلے پائے نظر کو زنجیر
دل کو جب دید کا ارماں ہے نہ جانے کیا ہو

شیوراج بہار

اس کو جینا اور مرنا آگیا — تیرا منشائے نظر جو پا گیا
جو زباں پر تیرا شکوہ آگیا — اپنی بے باکی پہ میں شرما گیا
آپ ہوں اپنی نظر میں اجنبی — کون میری زندگی پر چھا گیا!
مسکرا کر کس نے لیں انگڑائیاں! — رقص کرتا موسمِ گل آگیا
جب کیا ترکِ محبت کا خیال — ان کا پیمانِ وفا یاد آگیا
رک گئی ہو جیسے نبضِ کائنات — ان کے جاتے ہی یہ عالم چھا گیا

زندگی جینا جتاتا ہے بہار!
مسکرا کر غنچہ یہ سمجھا گیا

تسخیر فہمی

یہ بات بھی نہیں کہ پریشاں نہیں رہے — لیکن ہم ان کے غم سے گریزاں نہیں رہے
دنیا کو ہم نے درسِ وفا کب نہیں دیا — کب ظلمتوں میں نور بداماں نہیں رہے
ہوتی تھی اس سے عشق کی توہین اس لیے — ہم شکوہ سنجِ تلخیٔ دوراں نہیں رہے
کہتے ہیں لوگ اب نہیں باقی وہ رونقیں — ہم انجمن میں جب سے غزل خواں نہیں رہے
وہ عظمتیں حیات کی حاصل نہ کر سکے — طوفاں میں حادثوں کے جو خنداں نہیں رہے
ماحول کتنا تلخ ہوا کچھ نہ پوچھیے — جب زندگی پہ عشق کے احساں نہیں رہے

فہمی پھر اس میں کیف نہ ہوگا کوئی اگر
ہم قصۂ حیات کا عنواں نہیں رہے

رئیس نعمانی المرادآبادی

کیا پائے گا راہ میں یوں مجھ کو چھوڑ کر — دیکھا ہے دوستو بھی پتھر کو توڑ کر
چلنا ہے یوں ہی شانہ سے شانہ کو جوڑ کر — کردو یہ تم بھی وقت کی آنکھیں مروڑ کر
باندھی ہیں اس دہر نے آنکھوں پہ پٹیاں — میری حیاتِ شوق کا آئینہ توڑ کر

آئینہ ہو ہی جائیں گے پردے دماغ کے
کچھ روز ذہن و دل میں ابھی تو جھنجھوڑ کر

ساقیٔ دکن

(نظامِ دکن میر عثمان علی خاں مرحوم آصفِ سابع کی یاد میں)

نثار خلیل

جنوں کی سربلندی، آگہی کا بانکپن ساقی
عقیدت سے فرامیں تک ترا دیوانہ پن ساقی
تری شاہی میں تھا عکسِ جمالِ صبحِ جمہوری
صدائے بزمِ فردا تھی کرن اندر کرن ساقی
دکن کا چپہ چپہ ہے فروزاں تیرے جلووں سے
شبستانِ نازِ آبِ حضر ہے تیرا چمن ساقی
ترا دورِ حکومت تھا کہ اک دورِ مسیحائی
حیاتِ جاوداں بخشی بنامِ علم و فن ساقی
ترے نقشِ قدم تاریخ کی راہوں میں روشن ہیں
رہیں گے مدتوں تو دقت پہ سایہ فگن ساقی
تدبر کے فراست کے نئے جوہر تراشے تھے
دیا تھا زندگی کو تو نے عزمِ تیشہ زن ساقی
ترے ذوقِ تغزل کی مدح خواں روحِ ثقافت تھی
ترا پیغام گر رکھتا اضیاء جانِ وطن ساقی
رہے ہیں ہم نوا اہلِ [illegible]
مبارک [illegible] سال
معارف پروری، دانش گہر عثمانیہ تیری
کرم سے ہے اور بھی تعمیرِ شعورِ فکر و فن ساقی
روایاتِ سلاطینِ سلف تابندہ تھیں تجھ سے!
تجھے کیسے بھلائیں گے یہ تیرے اہلِ وطن ساقی
ترے سازِ نفس پر عظمتوں کے گیت رقصاں تھے
ترے ماتھے پہ تھا حسنِ وفا کا بانکپن ساقی
لقب اردو کے محسن کا تجھی کو زیب دیتا ہے
ترا چرچا رہے گا انجمن در انجمن ساقی
کسی طوفاں نے جنبش دی نہ پائے استقامت کو
نہ آئی تیرے ماتھے پر کبھی کوئی شکن ساقی
محبت کا، رواداری کا، تہذیبوں کا سنگم تھا
تجھے روئے گا عہدِ نو، حیدرآبادِ دکن ساقی

رباعی

نوبہار صابر

اک صیغۂ اظہارِ مطالب ہے زبان
جذبہ ہے اگر روح تو قالب ہے زبان
مذہب ہے کوئی اس کا نہ فرقہ صابر!
تلسی کبھی نانک کبھی غالب ہے زبان

عبدالسلام

خورشید بہو کا قضیہ

جس وقت میں اپنے مقالے کے سلسلے میں مرزا رسوا کے ناول جمع کر رہا تھا مجھے "خورشید بہو" کے نام سے ایک ناول نظر آیا۔ اس پر مصنف کا نام "ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا مصنف "امراؤ جان ادا" "اختری بیگم" درج تھا۔ اسے کتب خانہ "دین و دنیا" شاہی بازار حیدر آباد (پاکستان) نے شائع کیا تھا۔[1]

اس کتاب کی پہلی سطر ہی اس کے مرزا رسوا کی تصنیف ہونے کی تکذیب کر رہی تھی۔ کتاب اس عبارت سے شروع ہوتی ہے "بہت دنوں کی بات ہے شاید پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے ہی کا ذکر ہو" یہاں مصنف یہ بھول گیا کہ یہ جملہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ لکھنے والے نے دوسری عالمی جنگ کی کم از کم ابتدا ضرور دیکھی ہے۔ مرزا رسوا کی زندگی میں "پہلی جنگ عظیم" ضرور واقع ہو چکی تھی مگر دوسری عالمی جنگ کے آغاز تک اسے صرف "جنگ عظیم" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ "پہلی" کا اضافی لفظ استعمال کرنے کی ضرورت تو دوسری جنگ کے بعد پیش آئی ہے۔ صرف یہ جملہ ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ مرزا رسوا کی تصنیف نہیں ہے۔

اس کے بعد بھی میں نے اس بے لطف کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا یوں تو مرزا رسوا نے "اختری بیگم" اور "شریف زادہ" جیسے ناول بھی لکھے ہیں جو "امراؤ جان ادا" کے مصنف کے نتائج طبع ہرگز نظر نہیں آتے مگر چند باتیں ان کے تمام ناولوں میں مشترک ہیں، مثلاً پلاٹ کی عمدہ تنظیم کہانی کہنے کا ایک مخصوص انداز اور ان کی زبان۔ یہ تینوں باتیں اس ناول میں نظر نہیں آئیں۔

"خورشید بہو" میں ہیرو کا کردار اس طرح بیان کیا گیا۔

"نے کنجوس تو نہ تھا مگر موقع و محل سے روپیہ صرف کرنے کی اس میں لیاقت نہ تھی۔ خود پسند نہ تھا مگر برا کہنے سے چڑ ضرور جاتا۔ حلیم تھا مگر اپنے حکم کے بے موقع صرف کیا کرتا۔ تنک مزاج نہ تھا مگر جب کسی بات پر غصہ آجاتا تب اس کا دل قابو میں نہ رہتا"

مرزا رسوا کا اپنے کردار کا تعارف کروانے کا انداز اس سے قطعی مختلف ہے۔

ہیروئن کا کردار بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

"متمدن لڑکی تھی مگر سٹرن۔ تلون طبع۔ آوارہ مزاج نہ تھی۔ کاہل تھی جاہل نہ تھی۔ جہاں زبان کی پھوہڑ تھی وہاں ہاتھ کی سوگھڑ بھی تھی۔ ناعاقبت اندیش تھی بد اندیش نہ تھی خوب سیرت تو نہ تھی مگر خوب صورت تھی۔ بدخو تھی عیب جو نہ تھی۔ خوشامدی نہ تھی۔ خوشامد پسند البتہ تھی۔ عیش پسند البتہ تھی عیاش نہ تھی، خود پرست تھی۔ زر پرست نہ تھی"

مرزا رسوا میں نہ تو شوق قافیہ پیمائی نظر آتا ہے اور نہ وہ اپنے کردار کو پیش کرنے کے لیے اس قسم کے تقابلی انداز کا سہارا لیتے ہیں۔ آگے چل کر غرض اور حیا کی کش مکش بیان کی ہے۔ مرزا رسوا کو ضرورت پیش آتی تو وہ چند جملوں میں یہ کام انجام دیدیتے مگر مصنف دو صفحے تک غرض اور حیا کے مکالمے لکھتا چلا گیا ہے۔

فنی اعتبار سے یہ پوری کتاب مرزا رسوا کے فن سے کوئی میل نہیں کھاتی۔ لہذا یہ تو بہ آسانی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب مرزا رسوا کی نہیں ہے۔ مگر پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا مصنف کون ہے۔

ڈاکٹر میمونہ بیگم کا مرزا رسوا پر مقالہ چھپ کر آیا تو امید تھی کہ انھوں نے شاید یہ معمہ حل کر دیا ہو۔ انھوں نے صرف یہ لکھا کہ "یہ ناول ان کی نہیں ہے"[2] انھوں نے ناشر کے ایک خط کی عبارت بھی درج کی ہے۔ مگر یہ تمام بیانات اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے کہ اس کتاب کا اصل مصنف کون ہے؟

میں نے اپنے بعض دوستوں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر انھیں "خورشید بہو" کا اصل نسخہ مل جائے تو وہ مجھے عنایت کریں۔ چنانچہ مشتاق بک ڈپو کے اکرام صاحب جنھیں اس سلسلے میں مشہور عوام تصور کیا جا سکتا ہے اصل نسخہ نکال لائے اس کتاب کے مصنف منشی عبدالحفیظ صاحب نگرامی سب انسپکٹر پولیس اضلاع شمال و مغرب داؤد ہیں۔ میرے پیش نظر اس کتاب کا چھٹا ایڈیشن ہے جو جون ۱۹۳۴ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا تھا اس کتاب کے آخری صفحہ پر جو عبارت درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی رجسٹری ۲۸ جولائی ۱۸۹۹ء کو عمل میں آئی۔ گویا یہ کتاب ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔

یہ کتاب "دین و دنیا" والوں کو مرزا رسوا کے پوتے مرزا محمد تقی نے دی تھی۔ ان ہی نے اصل کتاب کے پہلے صفحہ کی عبارت کو از سر نو ساڑھے تین صفحات میں پھیلا کر لکھا ہے یہ ساڑھے تین صفحے ان ہی کی ذہانت کا ثبوت ہیں مطبوعہ تحریف شدہ کتاب کے صفحہ ۸ کی ساتویں سطر کے آخری لفظ سے اصل کتاب کی عبارت شروع ہو جاتی ہے اور آخر تک اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ اصل عبارت یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ (باقی صفحہ ۱۱ پر)

---

[1] خورشید بہو طبع اول ۱۹۵۰ء صفحہ ۱
[2] مرزا محمد ہادی مرزا رسوا، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور صفحہ ۴۵
[3] مرزا محمد ہادی مرزا رسوا، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور صفحہ ۴۵

مراسلات

کبھی بھی۔ ابھی بھی۔ نہ ہی

اس طرف چند سالوں سے (خصوصاً ۴۷ء کے بعد) ریڈیو، اخبارات اور بعض ادیبوں کی تحریروں میں مندرجہ بالا الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں۔ کبھی میں بھی کا مفہوم پہلے ہی سے شامل ہے۔ اس لیے مزید بھی لگانے کی کیا ضرورت؟ جواب میں کہا جاتا ہے کہ کبھی کے مفہوم میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے مثلاً "فلاں شخص سے میں کبھی بھی نہیں ملا۔" "میں نے یہ بات کبھی بھی نہیں کہی۔" جواب میں عرض کیا گیا کہ نفی کو مزید زور پہنچانے کے لیے یا کبھی بھی کے مفہوم کو مزید تقویت دینے کے لیے اب تک صرف لہجہ میں زور دے کر لفظ کبھی کو ادا کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوتا رہا ہے۔ پرانے مستند شعرا یا نثاروں کے وہاں بھی اس کبھی بھی کا استعمال کسی بات کی نفی یا اثبات پر زور پہنچانے کے لیے نظر سے نہیں گزرا۔ کیا قارئین کرام اس ترکیب کے استعمال پر مزید روشنی ڈال سکیں گے؟

کچھ یہی حال ابھی بھی کا بھی ہے۔ پنجاب اور سندھی حضرات عموماً اور بعض دیگر صوبوں کے لوگ بھی ابھی بھی کا استعمال کرتے سنائی دیتے۔ مثلاً وہ ابھی بھی یہیں موجود تھا۔ یا ابھی بھی یہی بات فلاں شخص بتا کر گیا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ موقع ابھی بھی کہنے کا ہے تو وہ نہیں مانتے اور وہی دلیل لاتے ہیں کہ ابھی کو زور پہنچانے کے لیے ابھی کے ساتھ بھی کا استعمال ابھی کے مفہوم کو زور پہنچاتا ہے۔

تیسرا اسی قسم کا غلط استعمال نہ ہی یا نا ہی کا انگریزی کے حروف عطف NEITHER اور NOR کے ترجمے کے طور پر ہونے لگا ہے مثلاً وہ نہ احمد سے ملا نہ ہی محمود سے۔ یا " نہ اس نے لندن دیکھا ہے نہ ہی پیرس " یا اس نے نہ ہی لندن دیکھا ہے نہ ہی پیرس۔ ان سے کہا گیا کہ اردو کا محاورہ اور روزمرہ ان حروف نفی کو استعمال کرنے کا یہ رہا ہے۔ " وہ احمد سے ملا نہ محمود سے۔" یا " احمد سے ملا نہ محمود ہی سے۔" " اس نے لندن دیکھا ہے نہ پیرس " ویسے " اس نے لندن دیکھا ہے نہ پیرس ہی۔" مگر نا ہی کی ترکیب استعمال کرنے والے لوگ اسے نہیں مانتے۔

امید ہے کہ اڈیٹر صاحب یا دیگر ادبائے کرام ان الفاظ کے صحیح محل استعمال پر مزید روشنی ڈالیں گے تاکہ غلط اردو نہ رائج ہو۔

(ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

اردو کا پہلا ڈراما

" ہماری زبان " مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۶ء میں اردو ڈرامہ کی ایک طالبہ کا مراسلہ نظر سے گذرا۔ وہ فرماتی ہیں " بمبئی والوں کی اصطلاح میں اندر سبھا کو ڈراما نہیں کہا جاتا۔" خدا جانے محترمہ نے یہ نتیجہ کہاں سے اخذ کیا۔ ڈرامہ کو ہر جگہ ڈراما ہی کہا جاتا ہے۔ بمبئی والے بھی ڈراما کو ڈراما ہی کہتے ہیں۔ غلطی پر وہ لوگ نہیں جو رہس، جلسہ، قصہ، کہانی، مثنوی وغیرہ کو ڈراما کہتے ہیں اور بضد ہیں کہ رہس کو ڈراما کہا جائے۔ رہس رہس ہے اور وہ ہمیشہ رہس ہی رہے گی۔ کسی کے کہنے سے ڈراما نہیں بن جائے گی جب تک کہ وہ اپنی حیثیت کو آپ ہی بدل کر ڈراما کی شکل و صورت نہ اختیار کرلے۔

بعض لوگ پروفیسر مسعود حسن رضوی کو اس غلطی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں لیکن میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں۔ یہ غلطی گذشتہ پچاس سال سے نسلاً بعد نسلاً چلی آرہی ہے رضوی صاحب کا قصور صرف اتنا ہے کہ بلا سوچے سمجھے وہ بھی اسی دھارے میں بہہ گئے اور امانت کی رہس کو ڈراما کہنے لگے۔

اب حال یہ ہے کہ ادھر لب پر اندر سبھا کا نام آیا ادھر ذہن نے قلابچ بھری اور امانت کو سامنے لا کھڑا کیا۔ اصل یہ ہے کہ اردو اسٹیج کا امانت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ اردو ڈرامے کی بدقسمتی تھی کہ امانت کی رہس چھپی اور عام و خواص نے بغیر کسی تگ و دو اور تحقیق کے پارسیوں کی اندر سبھاؤں کو امانت سے منسوب کر دیا۔

اس غلطی کا ازالہ اسی وقت ممکن ہے جب پارسیوں کی لکھوائی اور اسٹیج پر پیش کی ہوئی اندر سبھائیں اور دوسری سبھائیں جو اندر سبھا کے طرز پر لکھی گئیں وہ منظر عام پر لائی جائیں۔

اندر سبھا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۳ء سے بہت پہلے باشندگان گجرات " ناٹک " کے روپ میں اور مرہٹے اور گھاٹی " تماشے " کی شکل میں اندر سبھائیں دیکھتے تھے۔ آج بھی بمبئی تھیٹر قدیم میں " اندر سبھا تماشا " دکھلایا جاتا تھا جو امانت کی اندر سبھا سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

جب پارسیوں خاص کر کنور جی ناظر نے " اندر سبھا ناٹک " کی طرف توجہ دی تو وہ امانت کے نام سے بھی واقف نہ تھے انھوں نے ہندو دیومالا کے ایک قصے کو بچوں کے لیے منظوم کرایا اور اسے ایک راگ راگنی میں دکھلایا۔ یہ تماشا ناکامیاب رہا۔ انھوں نے پھر اسے مختلف راگ راگنیوں میں عام و خاص کے لیے پیش کیا۔ یہ اوپرا خوب چلا۔

اب پارسیوں نے شاہنامہ کے ماخذات کی بجائے اندر سبھا ناٹک کی طرز کے منظوم قصے دکھلانے شروع کیے۔ میں نے اردو تھیٹر جلد اول کے صفحات میں ایسے پچاس سے زائد منظوم قصوں کے نام گنوائے ہیں جو اسٹیج ہوئے اور صفحہ ۲۴۳ پر

امانت کی اندرسبھا اور پارسیوں کی اندرسبھاؤں میں جو فرق ہے وہ بتلایا ہے۔

پارسی اپنے ڈراموں کے پلاٹ مختلف ماخذات سے حاصل کرتے تھے۔ میں نے صفحہ ۲۲۲ پر اس طرح لکھا ہے: "بے نظیر بدر منیر، اندرسبھا اور آسی جیسے دوسرے ڈرامے مثنویوں سے اخذ کیے گئے۔ رستم و سہراب اور شاہزادہ شیاوکس شاہنامہ سے، نورجہاں اور کرن گھیلا تاریخ ہند سے، علاء الدین الف لیلیٰ سے، گوپی چند اور ہریش چند ہندو دیومالا سے۔

پارسی منتظمین کمپنی مختلف پلاٹ حاصل کرنے کے بعد اپنی نگرانی میں "ڈرامے" لکھواتے اور انھیں ڈرامے کی حیثیت سے ہی اسٹیج کرتے تھے۔ اس کے برخلاف امانت نے اندرسبھا رہس کی صورت میں لکھی اور رہس کی صورت میں ہی اسٹیج کی پھر اس پر ڈرامے کا اطلاق کیونکر ممکن ہے۔ پارسیوں نے اس کے برخلاف ہندو دیومالا کے قصہ کو اندرسبھا کے نام سے بصورت وسیرت ڈراما لکھوایا اور بصورت وسیرت ڈراما ہی اسے اسٹیج کیا اس لیے وہ اندرسبھا "ڈراما" کہلایا۔ جب پارسیوں نے اپنے اسی ڈرامہ کو منظوم صورت میں پیش کیا تو اس کا نام "اندرسبھا" "اوپرا" رکھا۔ اردو اسٹیج کے آخری دور میں جب چھوٹی موٹی کمپنیاں سنگیت دکھلاتی پھرتی تھیں تو اندرسبھا کو سنگیت کی شکل و صورت میں لکھوایا گیا اور سنگیت کی حیثیت سے ہی اسٹیج کیا گیا اس وقت اس کا نام "اندرسبھا سنگیت" پڑا۔

محترمہ لکھتی ہیں (۲) .... بیانات سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ راجہ گوپی چند اور جلندھر ڈراما تھا ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی نقل یا کومک ہو"

ہونے کو تو بہت کچھ ممکن ہے۔ فی الوقت میں آپ سے کہوں گا کہ آپ میرے دو تین مضامین مطالعہ کیجیے۔ "اردو ڈراما غدر سے پہلے" اردو ادب علی گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء۔ "ماڈرن اردو اسٹیج کا پس منظر" آج کل دہلی جنوری ۱۹۵۹ء۔ اگر وقت ملے تو "اردو ڈراما ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۵ء تک" اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۵ء بھی پڑھ لیجیے ان میں آپ کو بمبئی تھیٹر کی مفصل تاریخ اور تاریخ کے بہت سے اہم فوٹو ملیں گے مثلاً (۱) بمبئی تھیٹر قدیم۔ (۲) قدیم بمبئی کا وہ حصہ جو بمبئی گرین کہلاتا تھا اور جہاں مشرق کا اولین ماڈرن اسٹیج بنا۔ (۳) بمبئی تھیٹر (۱۸۵۰ء) (۴) تھیٹر کی وسطی عمارت کا اظہار جنبٹ۔ (۵) راجہ گوپی چند اور جلندھر کا اشتہار (گلیگراف اینڈ کوریر بمبئی جلد ہشتم صفحہ ۲۸ تجرات - یکم نومبر ۱۸۵۳ء - (۶)- اردو کا پہلا ڈراما نویس ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ جس نے راجہ گوپی چند اور جلندھر لکھا

(۷) اردو تھیٹر کا بانی جگن ناتھ شنکر سیٹھ جس کی نگرانی میں راجہ گوپی چند اور جلندھر اسٹیج ہوا۔

محترمہ نے جن دو بیانات کی طرف اشارہ کیا ہے ویسے گجراتی اور مرہٹی میں درجنوں ملیں گے۔ ان میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ اردو ڈرامے کے باوا آدم اور بانی مبانی ہیں۔

ڈاکٹر محمد عقیل صاحب کے جواب میں جو مراسلہ بھیجنے والا ہوں اس میں ایک ایسے مرہٹہ کی طرف اردو داں طبقہ کی توجہ مبذول کراؤں گا جو نہ صرف مرہٹی اسٹیج کا خالق بننے کا دعویدار ہے بلکہ اردو اسٹیج کا بھی باوا آدم بننا چاہتا ہے حالانکہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء تک کے کسی اخبار یا رسالہ یا الٹنگ میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا پھر بھی مرہٹے اس شخص کی پوجا کرتے ہیں اور اس کی تصویر اپنے گھروں میں لگاتے ہیں۔ کوئی دعویٰ جب تک کہ تاریخ کی کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ صرف ایک بیان ہے۔ گھبرائیے اور مرزبان نے بھی بیانات دئے ہیں۔

(ڈاکٹر عبدالعلیم نامی)

ناصر شہزاد اور نگار صہبائی کی کچھ غلطیاں

ناصر شہزاد 'چاند کی پتیاں' اور نگار صہبائی 'جیون درپن' کی چند غلطیوں کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتی ہوں جن کو یہ کہہ کر معاف کر دیا گیا ہے کہ یہ مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں نہ تو ناصر کی غلطیاں قابل معافی ہیں اور نہ ہی نگار کی کمزوریاں نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ اس قسم کی غلطیاں مستقبل میں غلط فہمیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ ناصر کے گیت کی مندرجہ ذیل لائن ملاحظہ ہو۔

تجھ سے پریت کرے تو پریت کی سندرتا نبھائے
سرسوتی کہلائے

سرسوتی ہندو دیومالا میں علم کا نشان مانی گئی ہے لیکن ناصر نے اس کو محبت کا SYMBOL سمجھا اور انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ناصر اس کوشلیا کا
یہ دل کرشن مراری ہے

کوشلیا رام کی ماں تھیں۔ کرشن کی محبوبہ نہیں۔ لیکن ناصر کوشلیا کو کرشن کی محبوبہ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ کوشلیا ماں تھی اس لحاظ سے وہ ممتا کا SYMBOL تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن محبوبہ نہیں۔ میرے خیال میں وہ رادھا اور کوشلیا میں کوئی امتیاز ہی نہیں کر سکے اسی لیے انھوں نے کوشلیا کا شمار بھی گوپیوں میں کر ڈالا۔

جیون درپن میں بھی چند اسی قسم کی غلطیاں ہیں گیت کا

یہ بھی پڑھیے

کیسے ساگر پہ اشنان کرنے گئی
پھول بیٹھی کہ من کی ہے گاگر بھری
راکشس بندرابن میں تھا کوئی شام
بو دو بو کہاں میں گئی تھی شام

نگار نے کرشن کو راکشس کہا ہے۔ کرشن کو چھلیا، نرموہی، وبھی، ماکھن چور، چت چور، من ہر یا تو ضرور کہا گیا ہے لیکن ان کے لیے راکشس لفظ کا استعمال کہیں بھی نہیں ہوا ہے میرے خیال میں کرشن کے لیے راکشس لفظ نازیبا ہے۔

یہ غلطیاں جو بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں ہماری آئندہ نسلوں کے لیے بڑی غلط فہمی کا باعث ہوں گی۔

(قیصر جہاں)

شعرا سے التماس!

ایک عرصہ سے اردو شعرا نے تاج محل کو کثرت سے موضوع نظم بنایا ہوا ہے کیونکہ یہ تخلیقات منتشر ہیں اس لیے میں انھیں کتابی صورت میں یکجا کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں ہند پاک کے تمام اردو شعرا سے ملتمس ہوں کہ اپنی نظم جلد از جلد ارسال فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

شجاع خاور
۱۴۲۲، رودگران اسٹریٹ
لال کنواں۔ دہلی ۶

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

آپ کے ہر دل عزیز پرچہ میں ایک زمانہ دراز سے یہ شعر کس کا ہے کے عنوان سے استفسار فرمایا گیا تھا مگر اب تک کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ میرے لیے یہ ایک معمہ سا تھا! اتفاق سے ایک کتاب میں یہ شعر ملا اور یہ شعر میر حسین تسکین کا ہے جو مومن خاں مومن کے شاگرد تھے۔

(سید سرور حسین)

غالب سے منسوب ایک شعر کے بارے میں

(۱)

اسمٰعیل احمد مینائی نے صحیح تحریر کیا ہے کہ شعر مذکورہ منشی امیر مینائی کا ہے۔ "پیام یار" لکھنؤ بابت ماہ اکتوبر ۱۸۹۷ء میں (نکلے شب وصال بھی پہلو طلال کے) کی طرح پر غزلیں درج ہیں۔ صفحہ ۹ پہ پہلی غزل امیر مینائی کی ہے۔ جس میں ایک مطلع ہیں پوری غزل ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ سولہواں شعر یہ ہے ؎

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے سب آپ کا
دل لیجیے مگر مرے ارمان نکال کے

پہلا مطلع بھی سن لیجیے۔

نازک بہت ہیں ہونٹ مرے نونہال کے
ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

(رباب رشیدی)

(۲)

۱۵ فروری ۷۷ء کے "ہماری زبان" میں جناب اسمٰعیل احمد مینائی صاحب کا مراسلہ مندرجہ بالا عنوان سے نظر سے گزرا جس میں جناب محترم نے درج ذیل شعر ؎

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے سب کا
دل لیجیے مگر مرے ارمان نکال کے

کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ شعر امیر مینائی کا ہے جو مطبوعہ ہے مگر ان کے دو دواوین "مراۃ الغیب" یا "صنم خانۂ عشق" میں نہیں تھا البتہ کسی گلدستہ میں پوری غزل کے ساتھ شایع ہو چکا ہے" مجھے گمان گزرا کہ یہ شعر امیر مینائی کا نہیں ہے پھر بھی میں نے اس شعر سے متعلق یہ جاننے کی کوشش کی کہ آیا یہ شعر غالب کا ہے یا امیر مینائی کا۔

آج جب "نسخۂ حمیدیہ" دیکھ رہا تھا تو اس میں یہ شعر صفحہ ۲۴۷ پر یوں شایع ہوا ہے ؎

دل آپ کا؟ کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا؟
دل لیجیے مگر مرے ارمان نکال کے

میرا خیال ہے کہ یہ شعر غالب ہی کا ہے کیونکہ "نسخۂ حمیدیہ" "کلام غالب" سے متعلق مستند، مکمل اور جامع کتاب ہے گمان غالب ہے کہ غالب نے ؎

۱۔ اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۲۔ ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

وغیرہ وغیرہ "متفرق اشعار" کے تحت یہ شعر بھی لکھا ہوگا۔

(نجم الحسن انجم ادیب)

بہار میں اردو بنگلہ اور تامل کی تعلیم کا منصوبہ

پٹنہ۔ بہار کے نائب وزیر اعلیٰ جناب کرپوری ٹھاکر نے انکشاف کیا ہے کہ حکومت بہار اردو، بنگلہ اور تامل زبانوں کی تعلیم کو عام کرنے کا پروگرام رکھتی ہے جناب کرپوری ٹھاکر نے مزید کہا کہ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین سے مرکزی سالانہ امداد کی درخواست کی گئی ہے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ حکومت تینوں زبانوں کی تعلیم کو عام کرنا چاہتی ہے کہ ملک میں قومی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو۔

(دعوت دہلی)

اردو طلبہ کی جماعتیں قائم کرنے کا طریقہ

جنرل سکریٹری شاخ آندھرا پردیش کا بیان

حیدرآباد۔ جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے حسب ذیل بیان جاری کیا ہے۔

انجمن ہذا کی جانب سے اضلاع و تعلقہ جات کے تمام اردو دوستوں اور انجمن ترقی اردو کے ہمدردوں اور ارکنوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں کہیں تحتانی، وسطانی اور فوقانی مدارس میں آئندہ ماہ جون ۱۹۶۷ء سے اردو کی جماعتیں قائم کروانا مقصود ہو تو اس کے لیے حسب ذیل طریقہ کار اختیار فرمائیں:۔

(الف) نئے انتظامات کے تحت ہر مقام پر ایک تعلیمی کمیٹی ہوتی ہے سب سے پہلے آپ اس کمیٹی سے ربط پیدا کریں اور اس کے پاس اپنا مطالبہ پیش کریں۔

(ب) آپ کے مطالبہ کی بنا پر تعلیمی کمیٹی ہیڈ ماسٹر کے توسط سے جماعتوں کے قیام کے لیے تحریک کرے گی۔

(ج) جن مقامات پر تعلیمی کمیٹی موجود نہ ہو وہاں درخواستیں ہیڈ ماسٹر کے پاس پیش کی جائیں

(د) یہ تحریکیں مواضعات کی حد تک پنچایت سمیتیوں کو اور تعلقہ و ضلع کی حد تک ضلع پریشدوں کے پاس بھیجی جائیں۔

(ہ) ضلع پریشد تعلیمات کے متعلقہ حکام کو لکھیں گے اور ان سے ضروری منظوری حاصل کریں گے۔

مقامی کمیٹی یا ہیڈ ماسٹر کے پاس آپ جو محضر یا یادداشت پیش کریں اس کی ایک نقل متعلقہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر کے علاوہ انجمن ہذا کو بھی روانہ فرمائیں تاکہ انجمن کی طرف سے بھی نظامت تعلیمات اور متعلقہ عہدیداروں کو توجہ دلائی جاسکے۔

محضر یا یادداشت میں مطلوبہ جماعت، طلبہ یا طالبات کی تعداد صراحت کے ساتھ بتلائی جائے۔

امید کہ اردو کے ہمدرد اس جانب فوری توجہ فرمائیں گے تاکہ ان کے علاقے میں اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں بلا تاخیر قائم

جھلکیں

سری نواس لاہوٹی

ناگپور میں اردو کا ایک ہائی اسکول قائم کیا جائے

ناگپور میں اردو لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ کے اوپر ہے اور جن کے بچوں کے لیے ناگپور کارپوریشن کی جانب سے اور پرائیویٹ اداروں کی جانب سے پانچ اردو پرائمری اسکول چلائے جاتے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹر صاحب نے کارپوریشن کے حالیہ سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے کارپوریشن کی جانب سے دو مراٹھی اور ایک ہندی کے ہائی اسکول شروع کرنے کا اعلان فرمایا ہے لیکن اردو کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اس سے یہاں کے اردو داں طبقہ میں خاصی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

اسی سوال کو لے کر مسلم انتظامیہ کمیٹی مومن پورہ ناگپور کے ہوشمند ذمہ داروں نے جناب ایڈمنسٹریٹر صاحب کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں صاحب موصوف نیز حکومت مہاراشٹر سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ہزارہا اردو داں عوام کے جذبات کو سمجھتے ہوئے ان کے مطالبہ پر دھیان دیں اور جلد از جلد ناگپور میں کارپوریشن کی جانب سے ایک ہائی اسکول برائے اردو کے قیام کا اعلان فرما کر اردو جاننے اور پڑھنے والے بچوں کے ساتھ انصاف فرمائیں۔

ضرورت ہے کہ ناگپور کے گوشے گوشے سے اردو داں طبقہ نہ صرف اس سلسلہ میں صدائے احتجاج بلند کرے بلکہ ایک اردو ہائی اسکول کے کھولے جانے کا مطالبہ کرے اور ایڈمنسٹریٹر صاحب کو اپنی جانب سے ایک عرضداشت پیش کرے۔

(حسام الدین انجمن سکریٹری مسلم انتظامیہ کمیٹی ناگپور)

سارے ملک میں ہر سطح کی تعلیم علاقائی زبانوں کے ذریعہ دی جائے

نئی دہلی۔ ممبران پارلیمنٹ پر مشتمل تعلیمی کمیٹی نے اتفاق رائے سے یہ تجویز تیار کی ہے کہ سارے ملک میں ہر سطح کی تعلیم علاقائی زبانوں کے ذریعہ دی جائے۔ تعلیمی کمیشن رپورٹ پر عملدرآمد کرنے کے لیے طریقہ کار وضع کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کی دوسری میٹنگ میں جس کی صدارت وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین کر رہے تھے یہ فیصلہ کیا گیا۔

کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ تمام علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے منصوبہ تیار کیا جائے۔

(سیاست جدید کانپور)

پارلیمانی تعلیمی کمیٹی نے لسانی فارمولے کو کالعدم قرار دے کر دو زبانی پالیسی وضع کر دی

اردو، سنسکرت اور سندھی زبانوں کے سلسلہ میں خصوصی سفارش

نئی دہلی۔ پارلیمانی ممبروں پر مشتمل تعلیمی کمیٹی نے اتفاق رائے سے فیصلہ دیا ہے کہ سہ لسانی فارمولے کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ یہ مشورہ دیا ہے کہ ہر بچے کے لیے اس کی مادری زبان میں آئین کے گوشوارہ ۸ میں دی گئی ۱۴ زبانوں میں سے کوئی ایک یا انگریزی، یا کوئی دوسری غیر ملکی زبان پڑھنا لازمی قرار دیا جائے۔ وزارت تعلیم کے ایک ترجمان نے بتایا کہ نئی پالیسی کو دو لسانی پالیسی قرار دیا گیا ہے۔

کمیٹی نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ درجہ ۸ سے طالب علم اگر چاہے تو اپنی پسند کی کوئی تیسری زبان بھی پڑھ سکتا ہے۔ ہندی اور انگریزی کی لازمی تعلیم کے سلسلہ کو کالعدم قرار دیتے وقت کمیٹی نے ملک کے لیے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے خیال میں طلبہ اپنی مادری زبان کے علاوہ یقیناً دوسری لازمی زبان کے طور پر ہندی پڑھنے کو ترجیح دیں گے۔ کمیٹی بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ سکنڈری سطح کی تعلیم تک علاقائی زبانوں میں تعلیم دی جائے گی۔ لسانی اقلیتوں کے مفاد کو پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ اگر کوئی تعلیمی ادارہ کسی غیر علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہتا ہے تو صوبہ اس کی اجازت دے اور اس ادارہ کی مدد کرے۔ لسانی اقلیتوں کو یہ حق ہے کہ وہ تعلیمی ادارے قائم کریں اور اپنی اپنی پسند کی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائیں۔ عام قانون کے تحت اس قسم کے اداروں کو بھی صوبائی امداد دی جائے۔ لسانی اقلیتوں کے حالات کے پیش نظر مزید خیال بھی رکھا جائے۔ ان کالجوں کو جہاں ذریعہ تعلیم سنسکرت، اردو یا سندھی ہو جو علاقائی زبانیں نہیں تسلیم کیے جاتے اور امداد کے سلسلہ میں خصوصی خیال رکھا جائے۔ ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میعاد مقرر کی جائے گی تاکہ وہ علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ (سیاست)

پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا جلسہ

پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں حال ہی میں ایک جلسہ ہوا جس میں جناب مالک رام صاحب نے غبار خاطر پر مقالہ پڑھا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے فرمائی۔ مالک رام صاحب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ کہنے کو تو غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوں کی شکل دے دی گئی ہے۔ مالک رام صاحب کے مقالے کے دو حصے تھے۔ پہلے میں انھوں نے مکتوب الیہ کے خاندان پر روشنی ڈالی اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اس خاندان کے عروج و زوال کی داستان بیان کی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کی علمی و قومی خدمات کا ذکر کیا۔ دوسرے حصے میں غبار خاطر کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے حالات اور ان کی شخصیت کے بارے میں معلومات اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتیں۔ اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوب تحریر ہے۔ مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا نقطۂ عروج غبار خاطر ہی ہے۔ مالک رام صاحب نے مزید کہا کہ مولانا کی تحریر کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ خواہ معمولی سے معمولی چیز کا ذکر ہو، وہ اسے ازلی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فاضل مقالہ نگار نے مثالیں دے کر بتایا کہ مولانا آزاد عام واقعات کو فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے کے عادی تھے۔ مولانا آزاد مکہ (حجاز) میں پیدا ہوئے تھے اور اگرچہ مشق اور مزاولت سے انھیں اردو پر پوری قدرت حاصل ہو گئی تھی لیکن تلفظ میں عرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے اور اس کی مثالیں ان کی تحریروں میں مل جاتی ہیں۔

مقالے سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر و صدر شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ نے جناب مالک رام صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب دونوں کے کارنامے الگ الگ ہیں لیکن ایک خوبی دونوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ دونوں کے فرائض منصبی کا اردو زبان و ادب سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن دونوں نے دل و جان سے اردو کی خدمت کی ہے اور اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ پچھلے سال نذر عرشی اور ذکر غالب کی اشاعت اس کی بہترین مثال ہے۔ ذکر غالب کی اشاعت مالک رام صاحب اور ڈاکٹر آزاد دونوں کی مرہون منت ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بارے میں ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ ان کی تصانیف سے اردو زبان و ادب کا معیار و وقار بڑھا ہے۔

آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مالک رام صاحب پختہ کار کام کرنے والوں میں ہیں۔ ان کے ہاں علمی انکسار اور اعتدال پسندی ملتی ہے۔ اور عالمانہ وقار بھی۔ مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا بنیادی طور پر رومانیت پسند تھے۔ ان کی قومیت ہو یا اسلامیت دونوں کی نوعیت رومانی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے فاضل مقرر جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (امین عالم، ایم فل)

صفحہ ۶ سے آگے

"بیماریوں کے سبب سے ذیلی تقاضات پورے کہاں ہوئے!"

مرزا محمد تقی نے صرف "دین و دنیا" والوں کو ہی فریب نہیں دیا بلکہ "اردو اکیڈمی سندھ" میں بھی وہ اسی قسم کی سات آٹھ کتابیں دے کر کچھ وصول کر لے گئے تھے۔ علاء الدین خالد صاحب نے حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود ان کی امداد کرنے کے لیے جان بوجھ کر فریب کھا لیا تھا۔

اگر اصل کتاب کا دریافت ہونا تحقیق کے میدان میں کچھ قدر و قیمت رکھتا ہے تو اس کا سہرا اکرام صاحب ہی کے سر ہے۔ بہرحال اس چیز کو دریافت کرنے کے لیے خود مجھے کوئی پہاڑ نہیں کھودنا پڑا۔

تبصرے

مختار الدین آرزو

چند ادبی مسائل

از پروفیسر شاہ مقبول احمد، صفحات ۱۷۳، قیمت ۶ روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ صنم سبزی باغ پٹنہ ۴۔

"چند ادبی مسائل" شاہ مقبول احمد صاحب کے ان ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اردو زبان و ادب سے متعلق لکھے ہیں۔ یہ مضامین ۱۹۳۲ء اور ۱۹۶۰ء تک کے طویل عرصے میں مختلف اوقات میں مختلف محرکات کے تحت لکھے گئے۔ اس مجموعے میں گیارہ مضامین ہیں۔ آخری مضمون "میر تقی میر کی شاعری کے بعض پہلو" آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر کیا گیا تھا۔ بقیہ مضامین رسالہ اردو، رسالہ معاصر، رسالہ ندیم اور دوسرے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب پر مختصر تعارف پروفیسر سید حسن (شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) کا لکھا ہوا ہے۔ مصنف کے متعلق وہ تحریر کرتے ہیں "شاہ صاحب کو اردو زبان و ادب کے ساتھ زمانۂ طالب علمی ہی سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے بہار کی زبان و ادب کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی خصوصیات کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔ وہ مقامی الفاظ و محاورات کی تدریجی و سماجی اہمیت کے قائل اور ان کو ادب میں داخل کرنے کے حامی ہیں۔ وہ زبان کے معاملے میں کسی خاص خطے یا علاقے کی گروہ بندی یا تقلید کو اس کی توسیع کا مانع سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اردو زبان و ادب کے تمام سرمایہ کو عزیز رکھتے اور ہر علاقے کے ادیبوں اور شاعروں سے محبت کرتے ہیں۔"

بہار سے متعلق مندرجہ ذیل مضامین مجموعے میں شریک اشاعت ہیں: بہار کی عام زبان، بہاری بولی، بہار کا ماحول اور اردو ادب، جمیل مظہری کے بعض افکار، میر محمد یحییٰ تنہا عظیم آبادی، اور بہار کے چند ٹھیٹھ دیہاتی محاورے۔ آخر الذکر مضمون مختصر ترین مضمون ہے جو تقریباً سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور بہت محنت، کاوش اور توجہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اسے مولوی عبدالحق صاحب نے بہت پسند کیا تھا اور رسالہ اردو میں ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ مصنف نے بہار کی پہیلیاں بھی جمع کی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ وہاں کے دیہاتی گیت بھی جمع کریں۔ اگر وہ پیش نظر مضمون مزید تحقیق و اضافے کے بعد کتابی شکل میں علیحدہ شائع کر دیں اور اس کے ساتھ وہاں کی پہیلیاں اور دیہاتی گیت بھی جمع کر دیں تو یہ بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ بہار کے دیہاتی گیتوں پر ڈاکٹر شکیلہ اختر نے بھی کچھ کام کیا ہے اور بہاری الفاظ کا ایک ضخیم لغت جناب سید یوسف الدین بلخی ناصر نے بہت محنت سے مرتب کیا ہے لیکن کسی مناسب ناشر کے انتظار میں ایک عرصے سے غیر مطبوعہ پڑا ہوا ہے۔

شاہ مقبول احمد تحقیق کے میدان میں قاضی عبدالودود صاحب کے پیرو ہیں۔ اس مجموعے کے دو تحقیقی مضمون "سلیم عظیم آبادی" اور "واسوخت آبرو" پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ دوسرا مضمون تحقیق کا اچھا نمونہ ہے۔ اول الذکر میں مصنف نے میر محمد سلیم عظیم آبادی (متوفی ۱۱۹۹ھ) کی زندگی اور شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کے وہ تمام منتشر اشعار جو مختلف اردو تذکروں میں بکھرے ہوئے ہیں ردیف وار جمع کر دئے ہیں۔ بقول عاشق عظیم آبادی میر محمد سلیم صاحب دیوان شاعر تھے لیکن افسوس ہے کہ اب ان کے زائیدۂ فکر میں سے صرف ۹ قصیدے اور چند اشعار باقی رہ گئے ہیں جو شاہ صاحب کی توجہ سے ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ دوسرا مضمون "واسوخت آبرو" ہے۔ بہت عرصہ ہوا قاضی عبدالودود صاحب نے واسوخت کے موجد کی حیثیت سے آبرو (متوفی ۱۱۴۵ھ) کا نام لیا تھا اور اس کے ثبوت میں ایک قدیم بیاض سے آبرو کا واسوخت معاصر میں شائع کیا تھا۔ اس نظریے کی تائید میں پروفیسر مسعود حسن ادیب رضوی نے ایک دوسری قدیم بیاض سے یہ واسوخت شائع کیا۔ شاہ صاحب نے جناب آبرو کے اس واسوخت کے چند شعر شائع کیے ہیں جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی ایک قدیم بیاض میں درج ہیں۔

مصنف نے بہار کے مشہور اردو ناول "صورت الخیال" کو شاد کی تصنیف بتایا ہے (مطبوعہ)۔ اس کے متعلق جدید تحقیقات سے مصنف یقیناً واقف ہوں گے کہ اس کے مصنف سجاد عظیم آبادی مصنف "محل خانہ" ہیں۔

مصنف کے دو مضامین "بہار کی عام زبان" اور "بہاری بولی" سے ممکن ہے عام طور پر اتفاق نہ کیا جائے لیکن پھر بھی یہ دونوں مضامین غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور توجہ سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ ان مضامین کے متعلق مصنف رقم طراز ہیں: "ان مضامین میں بعض باتیں ایسی بھی ملیں گی جو رائج خیالات سے ٹکرائیں گی مگر میں نے مصلحت پر غور و فکر کے نتائج کو ترجیح دی ہے۔ اگر کوئی بات کسی گروہ کے عقیدے کے مطابق معلوم ہوتی ہے تو اس گروہ کی خوشنودی مطلوب نہ تھی۔ اور اگر کسی خیال سے کسی طبقے کی آرزو کو ٹھیس لگتی ہو تو اس کی آزردگی میری تحریر کا مقصود نہیں۔ اردو زبان و ادب کے ایک طالب علم کے طور پر میں نے ان مسائل کو سوچا ہے اور اس کے سود و زیاں کا اندازہ کر کے جو باتیں سمجھ میں آئی ہیں بے کم و کاست سپرد قلم کر دی ہیں۔"

اپنے مضمون "بہاری بولی" کے متعلق "گزارش" میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے: "بہاری بولی میں لب و لہجہ تلخ بھی ہے اور تیز بھی۔ اس کی سطریں بعض حلقوں میں جبین پر شکن کا باعث ہوں گی اور ظاہرا ایسا معلوم ہوگا کہ اتر پردیش، پنجاب و دکن سے لسانی طور پر علیحدگی کا اعلان ہے۔ مگر اس باب میں اپنا خیال یہ ہے کہ ملک کے تمام اردو مراکز دلی اور لکھنؤ کی وجہ سے باب دار علم و ادب ہوئے ہیں اس لیے علیحدگی کی تلقین کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ اس انتہا پسندی کی تہ میں دراصل جو جذبہ کارفرما ہے وہ تقلید کے خلاف اعلان جہاد ہے۔ تقلید ادب کو بے روح اور ادیب کو گمراہ بنا دیتی ہے۔ اس کے مشاہدے راستے میں لگاتی ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں کور چشم ہی نہیں کور باطن بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی کھینچی ہوئی ہر تصویر قالب بے جان ہوتی ہے۔ ہر مطالعہ و مشاہدہ کے باوجود اس کے پیش کردہ نقوش میں مدت کے بھولے خواب کی گمشدہ شکستہ اور ریزہ ریزہ قسم کی تفصیلات بھی نہیں ملتیں۔ ایسی تصویریں بے رنگ نہیں بلکہ بے ڈھنگی ہوتی ہیں جو اپنے خد و خال اور چہرے مہرے کو قیاس کی نارسائیوں کے حوالے کر دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تصویر تاثیر سے اور دوسری جانب ناظر تاثر سے تہی دامان ہوتے ہیں اور کارگاہ ادب میں دونوں نامراد رہ جاتے ہیں۔"

یہ مجموعۂ مضامین اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ پرنٹر منیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس میں چھپا کر اور ایڈیٹر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا